وحید احمد کا ناول ''زینو'': ماضی وحال کی جنگی سیاست کا عالمی منظر نامہ

روبینہ کوثر
طارق ہاشمی

Abstract:

The leaven of the novel is formed by reality and imagination. A novelist completes the distance from the past to the present and from the present to the future, embracing modern consciousness.The main character in Waheed Ahmed's novel "Zeno" was a mathematician and philosopher in ancient Greece who was born around 490 BC. The novelist has had this dialogue with the heads of the modern KG countries. Zeno presents to these chiefs the same position he had before Darius and Alexander in ancient times.The plot of the novel seems to be complex as well as giving the impression of magical realism technique. The story of the novel does not seem to stop anywhere and the process of one movement continues every moment. From the beginning to the end of the novel the world is different. It seems to be in the grip of wealth. It seems that it is not up to man to get out of this circle of time.

ناول کا خمیر حقیقت اور تخیل سے تشکیل پاتا ہے۔ ایک ناول نگار عصری شعور کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ماضی سے حال اور حال سے مستقبل تک مسافت کی تکمیل کرتا ہیاور ہر زمانہ اپنے عصری مزاج کے مطابق تخلیقی ادب کی پرورش کرتا ہے۔ جس طرح ہر مستقبل کا ایک ماضی یعنی زمانی پس منظر ہوتا ہے اسی طرح ہر ماضی کا ایک مستقبل ہوتا ہے۔ مختلف ادوار سے وابستہ قصوں کہانیوں کے مطالعہ سے انسان کے عہد بہ عہد بدلتے ہوءے زاویہ نگاہ کو پرکھنے اور سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے ادب زندگی سے زندگی کا رشتہ جوڑتا ہے۔

انسانی زندگی کے درمیان مسلسل آگے چلتے جانے والے "وقت" اور دلوں کے اندروں تک اتر جانے والی یادوں کے ساتھ انسانی احساسات کو اپنے دامن میں سمیٹ کر آگے بڑھ جانے والی صنف ادب ہی ہے۔ انسانی تہذیب کا ابتدائی زمانہ بے حد طویل ہے قدیم ترین دریافت شدہ آثار سے لے کر موجودہ انسان تک ارتقا کا کم وبیش

دس لاکھ سال کا عرصہ گزرا ہے۔ ۵۰۰۰ ق م سے ۵۰۰ ق م تک ساڑھے چار ہزار برسوں میں انسان نے بہت تیزی سے ترقی کی ہے۔ ۵۰۰ ق م کے بعد تہذیب کے مراکز مشرق وسطی سے بحیرہ روم کی طرف منتقل ہو گئے اور یونان و روما نے تہذیب انسانی کے ارتقا میں پیشوائی کا فریضہ انجام دیا یہ دور ۵۰۰ ق م سے ۸۰۰ تک جاری رہا ہے۔ اس عہد سے تہذیب انسانی کی تاریخ کا عہد اوسط (Medieval Period) شروع ہوتا ہے عہد اوسط کا وہ حصہ جس میں یونان و روما نے قیادت کی کلاسیکل عہد کہلاتا ہے۔ اہل یونان نے ایک عظیم الشان تہذیب کو پروان چڑھایا جو فنی اور ذہنی نمو کا شاندار مظہر تھی۔ دنیا کی سب سے قدیم تین تہذیبیں ہیں جہاں انسانی تہذیب نے جنم لیا۔ سبط حسن اپنی کتاب "ماضی کے مزار" میں لکھتے ہیں:

> ''اس زمین میں ماضی کے نہ جانے کتنے مزار پوشدہ ہیں۔ قومیں جن کا ایک فرد بھی اب صفحۂ ہستی پر موجود نہیں ہے۔ عقائد جن کا ایک پیرو بھی اب کہیں نظر نہیں آیا۔ پر رونق شہر، عظیم معابد اور عالی شان محل جن کے نشان بھی اب باقی نہیں لیکن ماضی کبھی نہیں مرتا۔ وہ خاک میں ملتے ملتے بھی اپنے فکر و فن اور علم و ہنر کا خزانہ حال کے حوالے کر جاتا ہے۔ حال جو مستقبل کا پہلا قدم ہے اجداد کے اس اثاثے کی چھان پھٹک کرتا ہے۔''[۱]

وادی نیل یعنی مصر کی تہذیب کی قدیم داستان ۵۰۰۰ ق م سے شروع ہو کر ۵۲۵ ق م تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیاس کے بعد خطہ ایرانیوں، رومیوں اور یونانیوں کے زیر تسلط آ جاتا ہے اور یوں اس کی عظمت یاد ماضی بن جاتی ہے مصر کی طرح وادی دجلہ و فرات کی تہذیب بھی قدیم اور دریائی نوعیت کی ہے مسیو پوٹا میہ اصل میں اس علاقہ کے لیے استعمال ہوتا تھا جو شینار کے شمال میں دونوں دریاں کے درمیان واقع ہے لیکن بعد میں پوری وادی دجلہ و فرات یعنی ایشیائے کوچک سے لے خلیج فارس تک سارے علاقے کو میسو پوٹامہ کہا جانے لگا اور ۱۹۱۸ء کے بعد سے اسے عراق کہا جاتا ہے۔ وادی سندھ کی تہذیب بھی مصر اور مسیو پوٹا میہ کی طرح دریائی نوعیت کی تھی وادی سندھ سے مراد وہ علاقہ ہے جسے دریائے سندھ اور اس کے معاون دریا (جہلم، چناب، راوی، بیاس اور ستلج) سیراب کرتے ہیں آج یہ علاقہ پاکستان کہلاتا ہے۔

ادب اپنے عہد کے ماحول، تہذیب طرز معاشرت اور طرز زندگی کی ترجمانی کرتا ہے اور ہم جس عہد کا ادب پڑھتے ہیں گویا ہم اس عہد کی تاریخ پڑھتے ہیں۔ فکشن اور تاریخ دونوں کا تعلق واقعات کے بیان سے ہے تاریخ کے بارے میں عمومی مفروضہ یہ ہے کہ یہ ماضی کے حقیقی واقعات سے سروکار رکھتی ہے جب کہ فکشن کے لیے حقائق کی نوعیت مختلف ہے یعنی تاریخ کے برعکس فکشن تخیلی، خیالی تخلیقی واقعات سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ فکشن میں واقعات تخلیق ہوئے ہیں جب کہ تاریخ میں پہلے رونما ہوئے واقعات کا بیان ہوتا ہے اس لیے ان دونوں کی نوعیت بیانیہ کی ہے۔ فکشن میں ہمیں گزرے ہوئے کل کے حقیقی واقعات کی تخلیقی بازیافت نمایاں نظر آئی ہے۔ فکشن

میں فرضی کرداروں فرضی واقعات، حالات اور حادثات کے ذریعے زندگی کی ایسی تصور کشی کی جاتی ہے جو نہ صرف قائین کو شعوری طور پر متاثر کرتا ہے بلکہ انہیں مسرت بھی عطا کرتا ہے۔

وحید احمد کے ناول ''زینو'' کا کردار 'زینو 'قدیم یونان میں ایک ریاضی دان اور فلسفی تھا جو ۴۹۰ قبل مسیح کے قریب پیدا ہوا تھا۔ اس نے اس وقت عظیم یونانی فلاسفروں کے خلاف بحث کرنے کی کوشش کرنے کے لیے تضادات پیدا کیے تھے۔ ''زینو'' موجودہ فلسفیانہ حلقوں میں نام کی پہچان کے لحاظ سے سقراط، ارسطو یا افلاطون کی طرح مشہور نہیں ہوا۔ زینو کا باپ افلاطون کا شاگرد اور ارسطو کا ہم عصر اور ہم جماعت تھا۔ زینو اپنے باپ کے ساتھ یونان کے دارالحکومت مقدنیہ سے دور ایک بجیرہ آ ژ پر رہتا ہے کیوں کہ اس جزیرے پر سونا بہت زیادہ ہوتا ہے اور زینو کے اندر یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ زمین کے اندر چھپا ہوا سونا دیکھ سکتا ہے ۔ پیشے کے اعتبار سے زینو کا باپ ظروف پر نقش نگاری اور مجسمہ سازی کرتا ہے زینو کی ماں ایک مصری مجسمہ ساز اور کوزہ گر کی بیٹی ہوتی ہے جس کے پاس تقریباً پانچ سو سال پرانے نوادرات تھے زینو کے لالچی باپ کی نظر ان نوادرات پر ہوتی ہے اور جب وہ سارے نوادرات زینو کے باپ کے پاس آ جاتے ہیں تو پھر اس کو ڈر ہوتا ہے کہ سکندر کا باپ بادشاہ فلپ دوم اس سے یہ سب چھین نہ لے۔ اس ڈر کی وجہ سے وہ ایتھنز کے جزیرہ "آ ژ "پر چلا جاتا ہے آ ژ جزیرہ اتنا ذرخیز ہوتا ہے کہ سونے کی ڈلیاں بھی زمین سے نکلنا شروع ہو جاتی ہے۔ یونان کا امیر ترین شخص بن کے لالچ میں زینو کا باپ زیادہ سے زیادہ سونا نکلتا ہے آخر کار وہ سونے کے کھونے کے خوف سے سونا کھا کر مر جاتا ہے۔ وحید احمد سلیم فواد کندی کو انٹرویو دیتے ہوئے اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ:

> '''زینو' نام پر بہت زیادہ بحث جاری ہے۔ "زینو "جو نام ہے اس کا صوتی تاثر مجھے بہت ہی پسند ہے اور یہ جو "زینو "میں نے اپنے ہیرو کا نام رکھا ہے یہ تخیلاتی ہے۔ Imaginary لوگ اس کو تاریخ میں جو دو بڑے زینو آتے ہیں ان کے ساتھ منتھی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور دلائل دیتے ہیں ۔ مثلاً ایک زینو Zeno of Eled تھا جس کے کہ Paradoxes بڑے مشہور ہیں۔ دوسرے Zeno of Citium، Stoic تھا جو میرا "زینو "ایک پہلے، ایک بعد میں دونوں زینو اس دور میں نہیں مجھے جب سکندر تھا ارسطو تھا یا دارا تھا یہ بات میں نے بہت سے لوگوں کو Clear کی ہے مگر پھر بھی لوگوں کے ذہین میں پھر بھی یہ بات آ جاتی ہے۔''[۲]

وحید احمد کے خیال میں جو لوگ فلسفہ پڑھتے ہیں یا جنھوں نے Greek Mythology پڑھی ہے تو ان کے ذہین میں فوراً یونانی دور کا ہی زینو آ تا ہے۔ وحید احمد نے ناول زینو کو داستان کی ساخت میں ڈھالنے کی کوشش کی اسالیب کے پرانے سانچوں کو پگھلا کر ایک نئے بیانیے کو ترکیب دیا جو متن کی داخلی اور خارجی دونوں سطح پر بہتا ہے جس کی وجہ سے ناول کے بیانیہ کو نامیاتی وحدت کے اندر دیکھنا اور سمجھنا ناممکن ہے۔ ناول محض اس کینوس کا کام دیتا

ہے جس پر کردار جلوہ گر اور واقعات وقوع پذیر ہوتے ہے اور یہ کینوس زمانی و مکانی حدود کے تابع ہوتا ہے۔ جسے زندگی زمین کے کینوس پر اپنے نقوش اجاگر کر رہی ہے۔ ہر نقش پہلے والے نقش سے الگ اور جدا ہے۔ ہر نقش میں اتنی جاذبیت ہے کہ وہ دیکھنے والے کی نگاہوں کو خیرہ کیے رکھتا ہے۔ زمین کے کینوس پر ابھرنے اور پیدا ہونے والے حالات و واقعات ہی کہانی کو جنم دینے کا سبب بنتے ہیں اور یہی کہانیاں عظیم ادب کا خاصہ بن کر ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتی ہیں۔

تیکنیکی اعتبار سے وحید احمد کا یہ ناول اساطیری اور داستانوی رنگ کے ساتھ ساتھ رومانیت کی معطر خلوتوں اور جلوتوں سے رونماں ہے۔ ناول کا پلاٹ پیچیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ جادوئی حقیقت نگاری کی تکنیک کا تاثر دیتا نظر آتا ہے۔ ناول کی کہانی کہیں بھی رکتی نظر نہیں آتی اور ایک حرکت کا عمل ہر پل مسلسل جاری رہتا ہے۔ ناول کے واقعات کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جوڑتا ہے کہ واقعات کی یہ بنی ہوئی زنجیر کہیں ڈھیلی نہیں پڑتی اور نہ ہی کوئی جوڑ کمزور نظر آتا ہے۔ واقعات کے بیان میں ناول نگار کا خداداد مشاہدہ ایک قیامت ڈھاتا رہتا ہے۔ قاری مصنف کے انداز بیان کے سحر سے حیران رہ جاتا ہے۔ ناول میں زندگی سے ماورا ایسی سچائیاں بیاں کی ہے جو انسان کو بہتر کامل انسان بننے میں راہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ مذکورہ ناول پڑھ کر یہی لگا کہ لکھت لکھتی ہے لکھاری نہیں لکھاری بہت مظلوم ہوتا ہے اطمینان شاید اس کی زندگی میں کہیں نہیں ہوتا ہمیشہ ایک بے کلی اضطرب یا تجسس اسے آگے بڑھاتا ہے۔ وہ تمام چیزیں، واقعات، کیفیات، جزئیات، کارگزاری، دن راتیں جو سب کے لیے معمولی ہوتی ہیں وہ لکھنے والے کو مستقل عذاب میں رکھتی ہیں اور جب تک وہ ان کرداروں کو صفحات پر منتقل نہ کر دے اسے سکون ہی نہیں ہوتا۔ اس حوالے سے ماریو برگس یوسا لکھتے ہیں: ''کتوب لے پاس ایک عجیب مخلوق ہے جو رفتہ رفتہ خود اپنے ہی کو کھا جاتی ہے۔''[۳]

اساطیری میتھ کے مطابق کتوب لے پاس ایک کیڑا ہوتا ہے۔ جو دم سے اپنے آپ کھانا شروع کرتا ہے اور آہستہ آہستہ خود ہی خود کو کھا جاتا ہے۔ اور جب کسی ادیب کے اندر جنم لیتا ہے تو وہ لکھے پڑھے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ یہ سب چھوڑتا ہے تو کتوب لے پاس کی طرح خود ہی خود کو کھانا شروع کر دیتا ہے۔ وحید احمد ۱۹۵۹ء میں فیصل آباد میں پیدا ہوئے، پیشے کے اعتبار سے گورنمنٹ پاکستان کے سول سرونٹ ہیں۔ آپ مشہور نظم گو شاعر ہیں پہلا مجموعہ ''شفافیاں'' ۱۹۹۴ء میں اور دوسرا ''ہم آگ چراتے ہیں'' ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ آپ نے نظموں کے ساتھ ساتھ ناول بھی لکھے ہیں، آپ کا مشہور ناول ''زینو'' ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آیا۔ وحید احمد نے مذکورہ پانچ سال (۲۰۰۳ء۔۱۹۹۸ء) میں مکمل کیا۔ ناول کا موضوع تیسری دنیا کی وہ استحصالی طاقتیں جو نت نئی پالیسیوں کے ذریعے اپنی اجارہ داری دنیا پر قائم کیے ہوئے ہیں۔ اس مختصر سے ناول میں فلسفیانہ تجربہ پنہاں ہے جو ادبی تخلیقیت کے محرک ثابت ہو سکتے ہیں۔ ناول اور فلسفے کے درمیان ایک اعلی درجے کا مکالمہ بلاواسطہ چل پڑتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''فلسفہ سوچ کا عروج ہے۔فلسفی کے مخصوص کردار کی عظمت کو ہم تہذیب وتمدن کے ارتقائی پس منظر سے اخذ کرتے ہیں۔پانچ درجے ہیں تہذیب وتمدن کے ارتقا کے پہلی سطح پر انسان کی مجبوری ہوتی ہے کہ وہ ضروریات زندگی تلاش کرے تاکہ جیا جا سکے۔تیسرا درجہ ہے ان فنون کی دریافت کا جن سے مہذب اور شائستہ عادات واطوار جنم لیتے ہیں۔چوتھا درجہ ان فنون کے مناسب استعمال کا ہے جو علم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔جب معاشرہ ان چار مدارج سے گزرتا ہے تو ایک مستحکم ریاست وجود میں آتی ہے اور زمین فلسفے کیلیے ہموار ہوتی ہے یہ پانچوں درجہ ہوتا ہے۔اول اول فلسفہ اشیا کو مادی وجوہات کے مطابق شناخت کرتا ہے اور جوں جوں ترقی کرتا ہے تو مادے سے مابعد الطبیعاتی اسرار پر کمندیں پھینکتا چلا جاتا ہے۔''[۱۴]

اعلی ادب پارہ وہی کہلاتا ہےجس میں وہ جدلیاتی استدلال کی ایک تائید ملتی ہے یعنی فن پارے میں کوئی حتمی یا ٹھوس معنی موجود نہ ہو۔جدلیاتی استدلال کے سبب قاری خود اپنے طور پر فن پارے کی صدا قتیں دریافت کرے۔ ناول میں ظاہری واقعات کا باطنی مفاہیم سے گہرا رشتہ ہوتا ہے اور کہانی کا ظاہر اور باطن آغاز سے انجام تک متوازی خطوط پر سفر کرتا ہے۔ "زینو" اپنے موضوع، زبان و بیان اور فنی کارگزاری کے لحاظ سے اردو فکشن کی قدیم و جدید روایت میں بالکل منفرد شناخت کا حامل ہے۔وحید احمد نے وقت کے ان شکستہ آئینوں کو صاف کرنے کی کوشش کی جو دو ہزار سال پر محیط ہیں اگر ماضی سے لاتعلق ہوتے ہیں تو ہمارا حال اور مستقبل دونوں دھوکے میں ہیں ہر مستقبل کا ایک ماضی اور ہر ماضی کا ایک مستقبل ہوتا ہے۔ادیب ذہنوں کی تشکیل کرتا ہے، ماضی، حال اور مستقبل کو سمجھنا ادیب کے لیے ضروری ہوتا ہے کیوں کہ ساحل پر کھڑے ہو کر دریا کی گہرائی کا اندازنہیں لگایا جا سکتا۔قدیم یونان کے فلسفے کا کلاسیکل دور جس کا مرکز ایتھنز رہا ہے بلواسطہ یا بلا واسطہ طور پر ناول پر چھایا ہوا نمایاں نظر آتا ہے۔ وحید احمد ادبی دنیا میں ناول نگار اور شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں انھوں نے جس طرح خود کو بطور نظم نگار منوایا ہے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ مسلسل ریاضت اور مطالعہ کا بھی ہاتھ ہے۔وحید احمد کی شاعری میں ادراک یعنی شعور کی فضا جس نوعیت کی ہے اس سے ایک پڑھے لکھے باشعور اور سوچنے والے ترقی پذیر آدمی کا سراغ ملتا ہے ۔ان کی شاعری بڑی حد تک زمان اور مکان کی حدود سے ماورا ہے۔جس طرح ان کے ناول "زینو" میں یونانی کردار ہے اسی طرح ان کی شاعری میں بھی یونانی کردار نمایاں ہے مثلاً "مرمت کون کرتا ہے:"

"سقراط جی!
میں فلسفے کا مستند استاد ہوں
میں اور لوگوں کے علاوہ آپکی تعلیم بھی بچوں کو دیتا ہوں

جہاں بھر کے بہت سے فلسفی،
تحقیق زیادہ بااثر کرنے کی خاطر
میری رائے کو کتابوں میں جلی حرفوں سے لکھتے ہیں.....................
جو ہوا
اس میں بھرا ہیں
اور جو ہونا ہے......اس میں ہے،
" مگر سقراط جی!
یہ وقت کے ٹکڑے یہ لمحوں کا برادہ بھرے بھرے، بیکا، دقیانوس وقتوں کے جلے لفظوں کی
میلی راکھ ہے۔'' ۵؎

انسانی فکر پر یونانی تہذیب نے بہت دیرپا اثرات چھوڑے ہیں۔ ۱۵۰۰ ق م میں بلقان کی پہاڑیوں کا سلسلہ جہاں سمندر میں جا کر ملتا ہے یونان وہاں واقع تھا۔ جمہوریت کا تصور سب سے پہلے یونان میں قائم ہوا جمہوریت کی نشو نما میں ایتھنز (Athens) سب ریاستوں میں پیش پیش تھا۔ ساتویں صدی قبل مسیح کا زمانہ ایتھنز کی سماجی اور سیاسی زندگی کا بدترین زمانہ تھا۔ ایتھنز کے دانشوروں نے ایک پڑھے لکھے معزز شہری ڈراکو (Draco) کا انتخاب کیا تا کہ وہ ایسے قوانین بنائے جو عام شہریوں اور غریبوں کو امروں اور حکمرانوں کے عتاب سے محفوظ کر سکیں۔ اس کا بنائے ہوئے قوانین Draconian Laws کے نام سے مشہور ہوا امیروں اور حکمرانوں کے لیا اس نے قانون شکنی کی ایسی خطرناک سزائیں تجویز کیں کہ ان قوانیں پر سمجھوتہ نہ ہو سکا تقریبا پچیس سال بعد ایتھنز کا مجسٹریٹ ایک ایسا شخص منتخب ہوا جس کا نام سولون (Solon) تھا سولون ہی وہ شخص ہے جس کے خاندان سے کوڈرس اور افلاطون کا تعلق ہے۔ اس نے ایک ایسے طرز حکومت کی تجویز پیش کی جس پر آج کی جمہوریت کی عمارت کھڑی ہے اس نے اس حکومت کو ۶۱۲ ق م میں جمہوریت کا نام دیا تھا اور یہی وہ طرز حکومت ہے جس میں ایک سپریم کورٹ کا قیام عمل میں آیا جس میں کوئی بھی شہری شامل ہو سکتا تھا اور جس کا انتخاب عام ووٹروں کی رئے ہی پر کیا جاتا تھا یہ عدالت مجسٹریٹ کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں سننے کی مجاز تھی جو تھوڑی سی بدلی ہوئی شکل میں ہمیں دنیا کے ہر ملک میں نظر آئی ہے۔ یونان کے زوال کی آخری حدوں سے ناول کا آغاز ہوتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار "زینو" ہی نہیں بلکہ ضمنی کردار بھی جاندار ہیں۔ اس ناول کا ایک اہم کردار وقت ہے وقت کی تباہ کاریاں اور وقت کی ستم ظریفیاں ازل سے ہی انسان کے مقدر کا سب سے بڑا المیہ رہی ہیں یہ سمجھنا ناممکن ہے کہ وقت آخر ہے کیا دنیا میں ثبات و قرار کسی شے کو بھی حاصل نہیں وقت ہر شے کو ہر آن تبدیل کرتا رہتا ہے۔ تبدیلیاں اس کائنات کی ہر چیز پر آتی ہیں۔ آخر وقت ہی ایسی پراسرار شے جس کے بارے میں کوئی بھی فلسفی حتمی بیان دینے سے کتراتا رہا ہے:

''جب سے تہذیب قائم ہوئی ہے کوئی بھی دور ترقی یافتہ نہیں رہا۔ وسائل کا حصول اور استعمال ہمیشہ سے انسان کا نصب العین رہا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وسائل کے حصول کا جذبہ پختہ ہوتا رہا۔ آج کل یہ جذبہ ایک جنون کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اسی لیے دنیا پر کسی شخص کی حکومت نہیں...... دنیا پر جنون حکومت کرتا ہے۔''[۶]

اس میں کوئی شک نہیں کہ کائنات کا سارا نظام وقت ہی کا اسیر ہے اور اسی کے تابع ہو کر کام کرتا ہے۔ کائنات کے اس منظم نظام میں انسان کے لیے یہ سبق پوشیدہ ہے کہ وقت کی قدر کرے اور خود کو نظام کائنات سے ہم آہنگ کر کے فطرت کے مقاصد کی تکمیل کرے۔ ہر عہد میں وقت کا تصور پیش کیا گیا۔ زماں ایک ذات کل ہے۔ یہ لامتناہی ہے۔ اس کی نہ تو کوئی ابتدا ہے اور نہ ہی انتہا یہ ازل سے ہے اس کے کتنے عکس ہیں۔ نفرتوں، محبتوں اور جنگوں نے وقت کو بے قابو قرار دیا ہے جو کسی کی دسترس میں نہیں جو ایک کارواں کی مانند ہے وقت نہ تو ماضی کا افسوس ساتھ لے کر چلتا ہے۔ نہ مستقبل کی فکر وقت کہیں کہیں زمانے کو تقدیر کا مترادف بھی کرتا ہے۔ وقت اب تک انسان کے مشاہدے میں آنے والے عوامل میں سے پیچیدہ مشکل مظہر ہے۔ کائنات کی واحد سچائی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس کے اندر زمان و مکان دونوں گم ہیں تمام ذی روح اور مردہ اشیا عوامل کا وجود وقت کے مرہون منت ہے۔ ناول میں وقت ایک اہم تھیم کی حیثیت سے ابھر کر آتا ہے ناول کا مرکزی کردار "زینو" جس میں سارا زمانہ ماضی، حال اور مستقبل بیک وقت موجود ہیں۔ خالد اقبال یاسر لکھتے ہیں۔

''زینو میں سارے زمانے وقت کے تسلسل میں پروئے ہیں مگر اس طرح کہ ان سے ایک دائرہ تشکیل پاتا ہے۔ وحید احمد کے ناول کا مرکزی خیال یہ ہے کہ انسانی فکر ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے بھی ویسی ہی ہے جیسی قدیم زمانے میں تھی۔ ہر زمانے میں یہ بار بار اپنے آپ کو دہرائی چلی جاتی ہے۔ اب بھی دنیا میں وہی کچھ ہو رہا ہے جو دو چار ہزار یا سات ہزار سال پہلے ہوا کرتا تھا۔''[۷]

وقت مسلسل رواں ہے ہر شے وقت کے اندر ارتقا پذیر ہے پرانے شاہکار مٹ کر ماضی کا حصہ بن جاتے ہیں اور نئے وجود میں آتے ہیں۔ آمنہ کوثر لکھتی ہیں:

''وقت مسلسل چلتا رہتا ہے اور رکنا نہیں جانتا وقت دراصل غیر فضائی nonspatil اور بالفاظ دیگر زمانی Temporal واقعات کا ایک تسلسل ہے جو ناقابل للعکس irreversible ہوتے ہیں اور ماضی سے حال اور پھر کی جانب رواں رہتے ہیں۔''[۸]

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کی حیرت انگیز پیش رفت انسان کی مابعد الطبیعاتی نظام اور اس کے

پرانے اصول وضوابط پر کاری ضرب لگاتے ہیں:

''سیاسی کیمیا گری نے دنیا کی معیشت کو سونے کے معیار سے تبدیل کر کے کرنسی نوٹوں اور بینک سرٹیفکیٹوں کی شکل دیدی ہے۔ گزشتہ صدی کی عالمی جنگوں نے بین الاقوامی معیشت کو ایک نئی نہج پر لا کھڑا کیا ہے۔''۹

قدیم ادوار میں سونا اور چاندی کرنسی کے طور پر استعمال ہوتا تھا جس کے پاس زیادہ خزانہ ہوتا وہ زیادہ طاقت ور ہوتا لیکن اب حکومت اور بینک کے گٹھ جوڑ سے بنی کاغذی یا ڈیجیٹل کرنسی سماجی بناوٹ کی بجائے قانونی مجبوری بن کر رہ گئی ہے دوسری جنگ اعظیم کے بعد عالمی سطح پر بڑی طاقتوں میں سے کئی بڑے ملک علاقائی اور لسانی بنیادوں پر چھوٹی چھوٹی مملکتوں میں تقسیم ہو گئے روس میں ایک مخصوص سماجی نظریے کی بنیاد پر قائم ہونے والا نظام پارہ پارہ ہو گیا دنیا کے بیشتر حصوں میں نسلی، علاقائی اور مذہبی بنیادوں پر آمنے سامنے کی جنگ ہونے لگی اور ترقی پذیر ملک ایک ہی طاقت کے اطاعت گزار بن گئے۔ عالمی جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی نو آبادیاتی نظام کا بھی خاتمہ ہوا جس کے نتیجے میں ایشیا اور افریقا کے بہت سے ممالک آزاد ہوئے لیکن ہوا کیا کہ نیو ورلڈ آرڈر کو ایک فلسفہ کے تحت آئی ایم ایف عالمی بینک اور عالمی تجارتی تنظیم کے تحت گلوبلائزیشن کے نام سے مسلط کر دیا گیا۔ جب کہ معاشرے کی سماجی تنظیم کو نیو ورلڈ آرڈر نے چھین لیا۔ غربت کے باعث دنیا بھر میں امریکا نے دہشت گردی کے ذریعے مزید تباہی پھلائی قرضوں کے بوجھ تلے دبے پاکستان میں کرپٹ عناصر جمہوریت کو اپنے مفادات کی لونڈی سمجھتے ہیں جس کے نتیجے میں سماج میں کرپشن کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور ایسی بیمار ثقافت سے جنم لینے والی جمہوریت بھی بیمار جمہوریت کہلاتی ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر خود مختار ریاستوں کے لیے خطرہ اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کا ایک بڑا جھوٹ ہے جبکہ دہشت گردی خود امریکا میں پروان چڑھتی ہے جس طرح ہنوز امریکہ گلوبلائزیشن کا نعرہ بلند کرتا ہے بالکل ایسی طرح سکندر نے پوری دنیا پر عالمی حکومت کرنا کا خواب دیکھا تھا کئی صدیوں کے مسافت کے بعد بھی امریکا کی پالیسی اور سکندر اعظم کی حکمت عملی میں کوئی واضع فرق نظر نہیں آتا۔ سکندر کی طرح امریکا نے بھی اقتدار کی ہوس میں شہروں کے شہر تباہ کر دیے انسانیت کا قتل عام کیا بے انصافی سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا زینو جب سکندر کو دولت کی پیشکش اس شرط پر کرتا ہے کہ دولت حاصل کرنے کے بعد یتیم یونان تک ہی محدود رہو گے تو سکندر اس پیشکش سے دولت محصول کرنے سے انکار اس وجہ سے کرتا ہے کہ اسے دولت سے زیادہ اقتدار کا جنون ہوتا ہے:

''سکندر نے کہا، جب میں پیدا ہوا تو میری کم عمری اور بلند بختی کی پیش گوئی کر دی گئی تھی۔ میں اپنے بخت کو سورج کی طرح چمکتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ شاروں کی طرح ٹمٹماتا ہوا نہیں سکندر اعظم فاتح عالم بنے گا۔ نہ صرف یہ سکندر دارا کی رعونت خاک میں ملائے گا بلکہ پوری دنیا کو مہا یونان کی شکل دے گا۔ اس طرح نہ صرف یونان کا اندرونی خلفشار ہمیشہ کے لیے دم توڑ دے گا

بلکہ دارائی ریشہ دوانیوں کا بھی مستقل خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر سکندر کا علم کیسے ہوگا؟ اس طرح
بخت کا سورج طلوع نہیں ہوگا۔''۱۰

یہ کتنا گہرا ناول ہے اس کا اندازہ تو متن کے سمندر میں اتر کر ہی لگایا جا سکتا ہے۔ تخلیق کار فن پارے میں خدا کی طرح اپنی مرضی کی دنیا تخلیق کرتا ہے اور فن کار کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ خواب سے حقیقت کی طرف، ماضی سے مستقبل کی طرف اور فلسفے سے سائنس کی طرف کس طرح سفر کرتا ہے۔ ناول "زینو" میں وحید احمد نے وقت کو اپنے اختیار میں رکھنے کا کھیل پیش کیا ہے۔ ناول کا کینوس بہت وسیع ہے جس میں پانچ سو قبل مسیح سے لے کر ۲۰۰۳ء تک کے سیاسی اور معاشی پس منظر کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار "زینو" ایک گلوبل کردار ہے جو تین براعظموں یورپ، افریقہ اور ایشیا پر پھیلا ہوا ہے۔ زینو عالمی شعور و لاشعور کی علامت ہے، وحید احمد اس تخیلاتی کردار کے ذریعے یونان، ایران، شمالی علاقہ جات چین، آسٹریلیا، جنوبی کوریا، شمالی کوریا، انگلینڈ، پاکستان اور ٹیکسلا کی سیاسی اور معاشی صورت حال کو بیان کرتے ہیں۔ تہذیب انسانی کے ارتقا کے بعد جب مختلف اقوام اور ممالک معرض وجود میں آئے تو ہمیشہ طاقت ور اقوام نے کمزور اقوام کے وسائل پر قابض ہونے کی جدوجہد جاری رکھی، مذکورہ ناول کی کہانی بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ زینو کا باپ افلاطون کا شاگرد ہے جس نے ساری زندگی ایک حرف تحریر نہیں کیا لیکن افلاطون نے زیتون کے درختوں کے جھنڈ میں اکیڈمی میں بیٹھ کر جو سنا اس میں اضافہ کر کے اپنے استاد کو امر بنا دیا یہ حقیقت ہے کہ سچا فلسفی سچائی کا متلاشی ہوتا ہے، افلاطون فکر کا مرکزی مقصد فلسفی بادشاہ وہ مثالی ریاست کیلیفلا سفر کنگ کو لازمی قرار دیتا ہے ریاست اور شہریوں کی خوشحالی کا راز صرف اور صرف فلاسفر کنگ حکمرانی ہے:

''میں اس سلسلے میں افلاطون اختلاف کرتا ہوں۔ میں نے تحریر کیا ہے کہ فلسفی ہونا بادشاہ کے لیے
ناموافق اور نقصان دہ ہو سکتا ہے فلسفی کو فلسفی اور بادشاہ کو بادشاہ ہونا چاہیے۔ نظام حکومت چلانے
کے لیے بادشاہ کو فلسفیوں سے رہنمائی حاصل کرنا چاہیے۔''۱۱

زینو ایک رفارمر اور دانشور فلسفی ہونے کے باوجود بھی دارا اور سکندر کو جنگ سے باز نہیں رکھ پاتا۔ عالمی تاریخ پر مبنی ناول میں نتائج کو تبدیل کرنا وحید احمد کے لیے ممکن نہ تھا۔ سکندر کے جنگ کرنے پر زینو سکندر سے نفرت کرتا ہے تو ایتھنز چھوڑ دیتا ہے اسی طرح افلاطون سقراط کی موت کے بعد ایتھنز حکومت کی انتظامیہ سے نفرت کرتا ہے اور ایتھنز کو چھوڑ کر اٹلی، سسلی اور پھر ہندوستان کی طرف نکل جاتا ہے اور گنگا جمنا کے کنارے پنڈتوں اور کیانیوں سے علم و فن پر استاد کی طرح بحث کرتا۔

ارسطو بادشاہ فلپ کے بیٹے سکندر کی تعلیم و تربیت کرتا ہے، فلپ دوم کے اندر بھی دولت اور اقتدار کا لالچ ہوتا ہے 'کوہ پنیجم' کو فتح کر کے سونے کی کانوں پر قبضہ کرتا ہے۔ اس کا ذریعہ معاش جنگ کی صورت میں ملکی وسائل پر قبضہ کرنا ہوتا ہے۔ ۳۳۷ ق م میں فلپ نے کلوپیٹرا نامی مقدونیہ کی ایک لڑکی سے شادی کی تو سکندر کی ماں اولمپیاس

نے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ایک سال بعد جب فلپ اپنی لڑکی کی شادی میں مصروف تھا تو اسے قتل کر دیا گیا۔قاتل نے فرار ہونے کی کوشش کی مگر اس کے گھوڑے کا پاں راستے میں اگی ہوئی بیل میں اٹکا اور وہ گھوڑے سے گر پڑ ا تعاقب کرنے والوں نے اسے قتل کر دیا مگر اولیمپیاس نے خوشی منائی اور قاتل کی تدفین بھی شاہانہ انداز میں کی:

> ''فلپ دوم قتل ہو چکا تھا۔مرتے وقت اس نے ہاتھ اپنے سر پر پھیرے ہاتھوں کا پیالہ بنایا۔
> پیالے میں اس کا خواب تھا۔دم توڑتے ہوئے تصور میں اس نے سکندر کا ہیولا طلب کیا اور ہاتھ
> سکندر کے سر پر پھیرے۔خواب سکندر کے سر میں سرایت کر گیا۔''۱۲

ارسطو نے سکندر کو ہومر کی رزمیہ نظم ایلیڈ پڑھنا شروع کی۔مدرسے میں استاد اپنی مرضی کا نصاب پڑھاتا ہے جبکہ کے شاہی اتالیق اور مدرسے کے استاد میں فرق ہوتا ہےشاہی اتالیق وہی پڑھاتا ہے جو شہزادہ چاہتا ہے۔ارسطو کا سکول Lyceum ایتھنز میں مختلف علوم کی درس گاہ تھا یہ ایک ایسا انسائیکلوپیڈیا تھا جس میں تمام ممکنہ علوم موجود تھے۔فزکس، میٹافزکس، علم نجوم، بیالوجی، تھیالوجی، ادویات، تاریخ، ادب، سیاست اور اخلاقیات نمایاں علوم تھے جو اس سکول میں پڑھائے جاتے تھے۔سکندر کو سکندر اعظم بنانے کیلیے ضروری تھا کہ اس کے سامنے عظیم یونانی جنگجوں کا نقشہ شد ومد کے ساتھ کھینچا جائے اس لیا ارسطو نے کئی ماہ سکندر کو ہومر کی ایلیڈ پڑھائی۔ہومر کی طویل نظمیں اوڈیسی (Odyssey) اور ایلیڈ (Iliad) یونانیوں کی علمی، سیاسی، ادبی اور ثقافتی زندگی کی دستاویز ہیں۔

ہومر ایک نابینا شاعر تھا جس کا تعلق یونان کے مشرقی علاقے Lonia کے پہاڑی علاقے Chois سے تھا۔بہت سے نقادوں جب ہومر کی ان دو نظموں میں Visiual imagery کو دیکھتے ہیں تو یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہومر کی ایک تیسری آنکھ بھی تھی جس سے اس نے سارے عالم کو دیکھا اور وہ سب کچھ لکھا جو آنکھ والوں کو نظر نہیں آتا اور اپنے ان دو شاہکاروں کی بنا پر ہومر ہر عہد کا زندہ کہانی کار کہلاتا ہے۔ہومر دنیا دراصل یونانیوں کے عروج کی دنیا ہے جس میں کلچر، تہذیب، ادب ثقافت میں ترقی نمایاں نظر آتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہومر نے گھر گھر جھانک کر زندگی کا مشاہدہ کیا ہو چیزوں کو قریب سے دیکھا ہو اور پھر ہو بہو انہیں اپنی نظم میں بیان کر دیا ہو۔ہومر نے ان نظموں میں اپنے عہد سے ۴۰۰ ق م کے یونانیوں کی شاندار روایات اور فتوحات کو موضوع بنایا ہے۔ایلیڈ ۲۸ ہزار اور اوڈی سی ۲۵ ہزار اشعار پر مبنی نظمیں ہیں ہومر نے ان نظموں کو ۲۴ حصوں میں تقسیم کیا ہے ہومر کی یہ نظمیں عظیم Epic تصور کی جاتی ہے۔میدان جنگ کے نقشے، کرداروں کی جرات، شجاعت، جنگی فراست، تدبیریں اور داؤ پیچ ورجل کے بس کی بات نہیں یہ ہومر کا ہی کمال ہے، کہا جاتا ہے کہ سکندر اعظم ان تمام باتوں سے آگاہ رہنے کے لیے ہومر کی ایلیڈ اور اوڈی سی اپنے ساتھ رکھتا تھا تاکہ میدان جنگ میں فوجیں اس طرح ترتیب دے سکے جس طرح ہومر نے ترتیب دی ہیں۔ارسطو کا نظریہ ہے کہ ہومر Ecip Poetry کا سب سے بڑا اور اہم شاعر ہے۔ہومر کی شاعری میں جتنے بھی کردار ابھرتے ہیں ان سب کا تعلق حکمران طبقے سے ہے ہومر کے ہیروز

شہزادے، بادشاہ، دیوتا اور دیویاں ہیں عام انسانوں کے کردار ہومر کے ہاں اہمیت کے حاصل نظر نہیں آتے ہومر کرداروں کو امر بنانے میں ید طولی رکھتا ہے۔ ہومر کے نقاد اوڈی سی اور ایلیڈ کا جب تاریخی حوالوں سے جائزہ لیتے ہیں تو وہ اوڈی سی کو اوڈی سی یس کی دس سالہ جہاں گردی کی داستان قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ داستان ساری کہ ساری فکشن ہے لیکن ایلیڈ کے بارے میں ان کا کہنا یہ کہ یہ ایک تاریخی اور بنیادی طور پر حقیقت پر مبنی کہانی ہے داستان کی تفصیل کو افسانوی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن جہاں تک بنیادی کرداروں کا تعلق ہے یہ سچے ہیں ۔مواد، سوشل اور سیاسی پس منظر کو شک کی نظروں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ۱۲۰۰ قبل مسیح میں ٹرائے کا محاصرہ کیا گیا تھا اور یہ طویل لڑائی گئی تھی اور جن میں جن کرداروں کا نام ہومر نے اپنی نظم میں لیا ہے وہ اس لڑائی میں شامل تھے۔

جنگ بادشاہوں اور حکومتوں کے مفادات کی خاطر شروع ہوتی ہیں جن سے لاکھوں انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کو وحشت کا نشانہ بنتے ہیں اور ہتھیار قلم کی جگہ چلتے ہیں۔ اقتدار کی جنگ میں سارا نقصان ریاست کا ہوتا ہے ملک وقوم کا مستقبل داؤ پر لگا تا ہے۔ جب انسان کے پاس مادی وسائل کی کثرت ہوتی ہے تو اس کے اندار کا جنون اس کو اقتدار کی طرف مائل کرتا ہے۔ سکندر اقتدار کی ہوس ہی کی وجہ سے دوسری ریاستوں پر قبضہ کرتا ہے۔ ہمارا یہ المیہ ہے کہ تاریخی تسلسل میں انسان پر جنگی وحشت صرف سیاسی حصول اور اقتدار حاصل کرنے کے لیے ہی مسلط کی گئی، جس کے نتیجے میں بے دریغ انسانی جانوں کا زیاں ہوتا۔ جنگ میں جیت کسی کی بھی نہیں ہوتی لیکن شکست صرف انسانیت کی ہی ہوتی ہے۔ کبھی بھی ایک ملک دوسرے ملک کو نہیں مارتا بلکہ جھنگ مارتی ہے، کسی بھی سلطنت کا جتنا اقتدار سطح زمین پر پھیلتا ہے۔ اتنا ہی خون پھیلتا ہے اقتدار کے لالچ میں بے دریغ قتل وغارت کرنے کو بہادری کا نام دینا غلط ہیں، جنگ میں کوئی نہیں ہارتا بس انسانیت ہارتی ہے: ''ہتھیاروں کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔ تلوار کی آب اور آنکھ کے پانی میں فرق ہوتا ہے۔'' ۱۳

سکندر اور دارا سونے کی پیشکش کو ترک کر کے جنگ کو ترجیح دیتے ہیں، زمانے کی گردش واقعات کو دہراتی رہتی ہے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ کرلولیس، فرعون، دارا، سکندر، پال اور لی میں کوئی فرق نہیں تاریخ میں صرف ان لوگوں کے نام بدلے ہیں کردار نہیں۔ انسان کو دوبارہ نئے سرے سے بننا کی ضرورت ہے، مگر انسان کسی بھی دور تعلق رکھتا ہوں کسی بھی علاقے سے تعلق رکھتا ہوں کسی بھی علاقے سے تعلق رکھتا ہوں کسی بھی زبان سے تعلق رکھتا ہوں بالکل ویسے کا ویسا ہی ہے جیسا کہ وہ ہمیشہ سے تھا۔ یہ بات پوشیدہ نہیں کہ انسان کی واردات کا طریقہ تبدیل ضرور ہوتا ہے مقصد نہیں انسان کے مقدر کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ علم کی طاقت کی بجے دولت کی طاقت کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اقتدار کی مختلف اصطلات عالمی حکومت، نیو ورلڈ آرڈر، گلوبلائزیشن اور سکندر کا پوری دنیا کو مہا یونان کی شکل دینا سب ایک ہی معانی دیتے ہیں۔ زمانہ بدلا ہے، عہد بدلا ہے، وقت بدلا ہے، مگر انسان اپنی جبلت سمیت آج بھی وہیں کا وہیں کھڑا ہے۔ تاریخ کا سب سے بڑا سبق یہی حاصل ہوتا ہے کہ انسان نے تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ وحید احمد نے اپنے تخلیق کردہ کردار زینو کے ذریعے نا قابل تبدیل انسان کی جبلت کو اجاگر کرنے

کی کوشش کی ہے۔ مذکورہ ناول میں یہ بات نمایاں ہے کہ انسان نے زر پرستی کو خدا پرستی کی طرح مذہب تسلیم کیا ہے کون عاشق خدا کی ذات کا سارا چکر معاشیات کا ہے۔ جب دولت جمع کرنے کا جنون حد سے تجاوز کرتا ہے تو اس کو جائز ثابت کرنے کے لیے منطق اور فلسفے کا سہارا لیتا ہے: ''بے انتہا علم اور تحقیق کے بعد زینو کا باپ بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ علم طاقت ہے اور دولت بھی طاقت ہے۔''۱۴

ناول کی ابتدا سے اختتام تک دنیا ہر دور میں دولت کے شکنجے میں جکڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ وقت کا تسلسل غلام عباس کے افسانے آنندی کی طرح زینو میں بھی ایک دائرہ بناتا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وقت کے اس دائرے سے نکلنا انسان کے بس کی بات نہیں ارسطو کے شاگرد سکندر کی طرح موجودہ انسانیت کا خون پینے حکمران بھی انسانی حقوق کا درس دیتے نہیں تھکتے IMF، ADB، WHO یہ ترقی یافتہ G8 ممالک کے وہ شکنجے ہیں جس سے وہ ترقی پذیر ممالک کو اپنا غلام بنائے ہوئے ہیں:

> ''آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک بھی ان پانچ ملکوں کی کرنسی کو بنیاد بنا کر بین الاقوامی معیشت چلاتے ہیں۔ دنیا میں سوارب لوگ نہایت غریب ہیں اور روزانہ ایک ڈالر کما کر غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر لطیفہ یہ ہے کہ غریب ممالک امیر ملکوں کی کفالت کر رہے ہیں۔ امیر ممالک من مانی شرائط پر غریبوں کو قرضہ دیتے ہیں۔ غریب ملکوں سے اجناس اور خام مال سستے داموں درآمد کرتے ہیں اور اپنی مصنوعات مہنگے داموں انہیں برآمد کرتے ہیں۔''۱۵

وحید احمد قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ اقوام متحدہ کی ناک کے نیچے سازشوں کا کھیل کھیلنے والے ان مالی اداروں کا پردہ چاک کیا جائے۔ ناول میں زیتون، عقاب اور تیر کا تکرار علامتی طور پر استعمال کیا گیا ہے یہ تینوں علامتیں ون ڈالر سے ماخوذ ہیں۔ ڈالر کی طرح ناول میں بھی زیتون معاشی کنڑول، دولت اور امن جب کہ تیر جنگ کی علامت کے طور پر نمایاں نظر آتا ہے یہ ناول استعاروں کی ایک روشن کڑی ہے۔ وحید احمد کا ناول زینو کاغذ پر تو ختم ہو جاتا ہے لیکن قاری کے ذہن میں شروع ہو جاتا ہے زینو کا تیر کمان سے نکانا، تیر کمان میں بھرنا اور چڑھتے ہوئے سورج کو نشانہ بنانا قاری کے ذہن میں کئی سوال چھوڑ جاتا ہے۔

حواشی:

۱۔ سبط حسن، ماضی کے مزار، (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۶ء)ص ۵

۲۔ محمد سلیم فواد کندی، انٹرویو: ڈاکٹر وحید احمد، مشمولہ: آبشار چوک اعظم : اردوسخن پاکستان، شمارہ ۴، سن ن، ص ۹۸

۳۔ ماریو برگس یوسا، نوجوان ناول نگار کے نام خط، ترجمہ: محمد عمر میمن، (کراچی: شہرزاد، ۲۰۱۰ء)ص ۲۳

۴۔ وحید احمد، زینو، (فیصل آباد: مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۰۷ء)ص ۲۹

۵۔ وحید احمد، ہم آگ چراتے ہیں، (لاہور: دستاویز مطبوعات، ۲۰۱۵ء)ص ۳۳

۶۔ وحید احمد، زینو، ص ۱۹۴

۷۔ خالد اقبال یاسر، وحید احمد کا "زینو "اور زمانہ، مشمولہ: ادبیات، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، شمار ۲۴۔۱۲۳، جنوری تا جون ۲۰۲۰ء، ص ۱۷۳

۸۔ آمنہ کوثر، شمس الرحمٰن فاروقی اردو فکشن کے تناظر میں، (فیصل آباد: روہی بکس، ۲۰۲۰ء)ص ۸۹

۹۔ وحید احمد، زینو، ص ۱۵۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۲

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۰

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۶۳